

اسلامیات کا مطالعہ

مولانا امتیاز علی خان عسکری

ہندوستان میں ایک سے زائد ادارے مشرقیات اور اسلامیات پر کام کر رہے ہیں۔ جہاں تک عربی، فارسی اور اردو کے متون پر کام کرنے کا سوال ہے ملک میں اس کا معیار خاصا بلند ہو چکا ہے۔ حیدرآباد، بمبئی، دہلی، علی گڑھ، رام پور اور پیٹنہ سے شائع کردہ متون اس کا روشن ثبوت ہیں۔

اسلامیات پر مستقل کتابیں اور تحقیقاتی مقالے شائع کرنے میں دارالمصنفین اعظم گڑھ، ندوۃ المصنفین دہلی، اسلامک کالج حیدرآباد اور جامعہ ملیہ دہلی جیسے اداروں نے لائق ستائش خدمات انجام دی ہیں۔

ان کے علاوہ دہلی، علی گڑھ، لکھنؤ، پٹنہ، کلکتہ اور حیدرآباد کی یونیورسٹیاں بھی اس مہم میں برابر ہاتھ بٹا رہی ہیں۔ چنانچہ ان دانش گاہوں کے عربی، فارسی، اردو اور تاریخ کے شعبے، لسانیات و ادب اور تاریخ و تذکرہ پر طلبہ سے ریسرچ کر رہے ہیں اور صورت حال یہ ہے کہ اگر صرف گزشتہ ۲۰، ۲۵ سال کے کاموں کا گوشوارہ مرتب کیا جائے تو ایم اے اور ڈاکٹریٹ کے لئے لکھے گئے مقالوں کا شمار سینکڑوں تک پہنچ چکا ہوگا۔ یہ صورت حال بڑی خوش آئند ہے۔

لیکن جہاں تک اسلامک اسٹڈیز کا تعلق ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے کام کرنے والوں کے ذہن میں اس کی حقیقت، غرض و غایت اور اس کے مال و ما علیہ کا واضح تصور نہیں، اس لئے جو کام ہمارے یہاں ہوتا ہے، وہ لسانی، ادبی یا تاریخی زیادہ اور اسلامیاتی کم ہوتا ہے۔

ہمیں سب سے پہلے یہ متعین کرنا چاہیے کہ اسلامک اسٹڈیز کا مفہوم کیا ہے۔ ایسا کئے بغیر یہ بات واضح نہیں ہو سکتی کہ کسی شخص، جماعت، ادارے یا کسی تہذیب، ثقافت، فن، یا کسی عہد، خطے اور

لے سے ماہی "اسلام اور عصر جدید" دہلی سے شکرے کے ساتھ۔ (مُدیر)

نسل کے عام مطالعے اور اسلامیاتی مطالعے میں بنیادی فرق کیا ہے۔ عربی زبان کا ایک تو عام مطالعہ ہے۔ اس میں لغت، اشتقاق، صرف، نحو، معانی، بیان، نشر و نظم سب پر کام کیا گیا ہے اور کیا جا رہا ہے لیکن عربی ہی کا ایک مطالعہ اس نقطہ نگاہ سے ہے کہ اسلامی تحریک شروع ہوئی تو عربی زبان کا کیا انداز تھا اور اسلام نے اُسے اپنے مقاصد کے لئے برتاؤ اُس میں کیا کیا انقلابات رونما ہوئے، علوم لسان میں سے کون کون سے علم اسلامی ضرورتوں کے تحت ایجاد کئے، اور کن فنون کو دوسری قوموں سے مستعار لے کر ان میں نئے اصول و ضوابط کا اضافہ کیا۔ اور ان سے کس حد تک اسلامی مقاصد اور ضرورتوں کی تکمیل ہوئی، یا وہ کس حد تک اسلامی ثقافت کے آئینہ دار ہیں۔ پھر اسلامی ثقافت کے زیر اثر عربی زبان نے اُن زبانوں پر کیا اثر ڈالا، جن سے اسے سابقہ پڑتا رہا اور خود ان زبانوں سے اس نے کیا کیا اثرات قبول کئے اور وہ اسلامی ثقافت کے لئے مفید ثابت ہوئے یا مضر، ظاہر ہے کہ ان دونوں انداز ہٹے مطالعہ میں تین فرق ہے۔

اس کے بعد اسلامیاتی مطالعے کے مقصد کی تعیین و تحدید درکار ہے تاکہ اس نصب العین کے پیش نظر زیادہ سے زیادہ مفید طریق بحث کی طرف رہنمائی ہو سکے۔ مقصد کی بندی، وسعت اور اہمیت ہی طریق کار کی اصابت، افادیت اور مقبولیت کی ضامن ہوتی ہے۔ ہم کسی شخص سے بھی خدمت و فداکاری کا مطالبہ نہیں کر سکتے تا وقتے کہ پہلے یہ امر اس کے ذہن نشین نہ کر دیں کہ جس مقصد کے لئے قربانی درکار ہے، وہ بہریت حاصل کرنے کا ہے۔

اس کے بعد اسلامیاتی مطالعے کے مبادی کی تحصیل کا مسد سامنے آتا ہے۔ میری دانست میں اسلامیاتی مطالعہ کرنے والے کو سامی زبانوں میں سے عربی اور عربی کی پیشرو زبانوں میں سے عبرانی آرامی کا علم ہونا چاہیے۔ آریائی زبانوں میں سے فارسی لازمی اور سہلوی، ترکی اور پشتو استخوانی طور پر سیکھنا چاہیے، مغربی زبانوں میں انگریزی لازمی اور جرمن و فرانسیسی استخوانی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان زبانوں کی تحصیل کے بغیر یہ بحث مطالعہ ناقص و ناممکن رہے گا اور ہم عالمی برادری میں کوئی نمایاں مقام کبھی حاصل نہ کر سکیں گے۔

مبادی کے بعد اسلامیاتی مطالعے کے محور یعنی اسلام کا علم ضروری ہے۔ یہ محور اس حیثیت سے زیر مطالعہ آئے گا کہ وہ عقائد و اعمال کا ایک منظم اور مربوط مجموعہ ہے۔ عقائد و اعمال کی بحث سے ذرائع علم کی بحث اُبھرتی ہے، اور اس طرح ہم کتاب، سنت، اجماع اور قیاس سے دوچار ہوتے ہیں۔ ذرائع علم میں سے کتاب

پر بحث کے ضمن میں عقائد و اعمال کے ساتھ ساتھ قصص و امثال، تاریخ و جغرافیہ اور لغت و قواعد زبان پر بحث آتے ہیں۔

اس کے بعد یہ بحث سامنے آتی ہے کہ مذکورہ بالا ذرائع علم کے مشتملات کے بارے میں اسلام کا دعویٰ کیا ہے۔ آیا یہ کلاً یا جزاً ابداع ہیں، یا اتم سابقہ سے ماخوذ و مقتبس ہوئے ہیں۔ اسی ضمن میں گرد و پیش کے دوسرے مذاہب کا تقابلی مطالعہ بھی لازم ہو جائے گا، اور ہمیں یہودیت، نصرانیت، مجوسیت، صابیت، بدھ مت اور ہندو مذہب کا براہ راست علم بھی درکار ہوگا، تاکہ عدم علم یا علم کی کمی کی بنا پر غلط نتائج نکالنے کے مجرم نہ بنیں۔

کتاب سنت کی تشریح و تفسیر میں جو اختلاف رونما ہوا، اس کے وجوہ و اسباب کیا تھے، اس سے بحث بھی بے حد ضروری ہے۔ یہ بحث مختلف کلامی و فقہی مذاہب اور ان کے آراء و نظریات کی تحقیق و تفتیش تک پہنچاتی ہے جس سے ہم یہ جان سکتے ہیں کہ ان اصولی و فردعی فرقوں کے تصادم آراء و نظریات کے کیا مذہبی سیاسی نتائج نکلے۔ اسی ضمن میں یہ بحث بھی ہونا چاہیے کہ اسلام کوئی نظریہ حیات پیش کرتا ہے یا نہیں؟ اگر کرتا ہے تو اُس نظریے کے حدود کیا ہیں، اور اس کی عملیت و افادیت پر زمان و مکان کے تغیر کا اثر پڑتا ہے یا نہیں؟ اگر پڑتا ہے، تو اُس میں اس اثر کے قبول کرنے کی کس حد تک گنجائش ہے؟ نیز یہ کہ اس نظریہ حیات نے دوسری قوموں پر زندگی کے مختلف میدانوں میں کیا اثر ڈالا۔ کوئی بھی نظریہ جو اس کی عملی افادیت پر غور کرتے وقت یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ جن لوگوں نے اس کی علم برداری کی ہے، اُن کے اعمال زندگی کا اسلامیاتی نقطہ نگاہ سے جائزہ لیا جائے۔ اس طرح ہم تاریخ و تذکرہ کی سرحد میں داخل ہو جاتے ہیں اور علماء، صوفیاء، اہل حرفہ، سلاطین، وزراء اور امرار بہارا موضوع بحث ہو جاتے ہیں۔ ان کی کتاب زندگی کا مطالعہ ہمیں بتا سکتا ہے کہ اسلامی عقائد و اعمال نے خود ان طبقات پر اور ان کے توسط سے دوسرے انسانوں پر کیا مثبت اور منفی اثرات چھوڑے۔

چونکہ ادھر بیان کئے ہوئے تمام پہلوؤں پر بحث موضوعی اندازِ نظر سے بھی ہوتی ہے اور مدعوئی سے بھی۔ اس لئے انیسویں صدی کے نصف اول تک اسلامی علوم و فنون پر، یا اسلامی زاویہ نگاہ سے غیر اسلامی علوم و فنون پر، ہوا فائقانہ یا مخالفانہ، جو کچھ کام ہوا ہے، وہ سب کا سب اسلام کا موضوع مطالعہ قرار پاتا ہے، اور ہمارے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ اس سبکِ تاریخی خاکہ مرتب کر کے اس کی عملی

انفادیت کا غیر جانب دارانہ جائزہ لیں۔

رہا اسلام کا معروضی مطالعہ، تو اس بارے میں غور و فکر کرنا ضروری ہے کہ مذہب کے معروضی مطالعے کے حدود کیا ہوں، اور کس قسم کے موضوعات میں کس حد تک اسے بتا جائے، اور کیا اسلام کا معروضی مطالعہ کیا بھی گیا ہے۔ اگر کیا گیا ہے، تو اُس مطالعے کا تاریخی خاکہ اور جائزہ کیا ہوگا۔

ایک عرصے سے ہندوستان میں تحصیل علم کا عمومی مقصد معاشی سہولتیں مہیا کرنا ہے۔ ہر طالب علم یہ چاہتا ہے کہ ایسا علم حاصل کرے، جس کی جلد تحصیل ہو سکے اور جو باآسانی ذریعہ معاش بن جائے۔ چونکہ نیکمۃ تحصیل کے آخری مرحلے تک پیش نظر رہتا ہے، اس لئے ڈاکٹریٹ کے لئے مقالے لکھنے والے بھی ایسا موضوع پسند کرتے ہیں، جس پر کم سے کم محنت میں اور تا بہ امکان کم ترین مدت کے اندر مقالہ مرتب ہو سکے، خواہ مقالہ داخل کر دینے کے بعد یہ ہمیشہ کے لئے یونیورسٹی کے کسی تاریک کمرے ہی میں کیوں نہ پڑا سڑتا رہے۔

مزید برآں ہمارا ملک ابھی تک مختلف قسم کی ذہنی قید و بند میں جکڑا ہوا ہے۔ جب انسان کی عاقلیت اور میں خلل ڈالنے کے لئے معمولی سی بندش بھی کافی ہوتی ہے، تو جس کو مذہبی، سماجی اور سیاسی قسم کی بہت سی بندشوں سے سابقہ ہو، اس کا ذہن آزادانہ غور و فکر کے لئے کیسے آمادہ ہو سکتا ہے اور اگر کسی نہ کسی طرح یہ آمادگی برائے کار آ بھی جائے تو مسلمات قوم کے برخلاف نکل آنے والے نتائج کے اظہار کی ہمت کہاں! اور ہمت بھی فرض دام کر لی جائے تو تدردان کون ہے جس کی ہمت افزائی سے کام کرنے والوں میں دلولہ پیدا ہو اور ملک قوم کو اعلیٰ صلاحیتوں کے محقق میسر آتے رہیں!

یورپ و امریکہ کے لوگ سالہا سال سے آزاد زندگی گزار رہے ہیں۔ اُن کی فکر بھی آزاد ہے اور عمل بھی، چونکہ اُن کے اعلیٰ کاموں کے تدردان موجود ہیں، حکومتیں بھی اور سپیک ادا رہے ہیں، اس لئے انھیں کسی کام کے کرنے میں جو دشواریاں پیش ہوتی ہیں اُن کا حل بھی جلد یا بدیر نکل آتا ہے۔ آزادی و تدردانی نے اُن کے اندر جوش اور ہمت بھی پیدا کر دی ہے۔ یہ لوگ سچے سچے تائیدے توڑ رہے ہیں اور مادی جسم کے ساتھ فلک پیمائی پر قادر ہو چکے ہیں۔ چنانچہ ان کے اپنے جوش و ہمت اور ملک و قوم دونوں کی تدردانی نے ہر میدان میں انھیں کام کرنے کی بھرپور توفیق عطا کی ہے جس کی بدولت وہ مشرقیات پر زیادہ اور اسلامیات پر بھی وہ کچھ کر گزے ہیں جس کی ہم سے نقل بھی نہیں کی جاتی۔

آپ سب واقف ہیں کہ مستشرقین کئی کئی یورپین زبانوں کے ساتھ عربی و فارسی ہی نہیں، ان کی پیشرو زبانیں عبرانی، سریانی و آرامی اور پہلوی اور اوستائی بھی جانتے ہیں۔ اس لئے جب وہ عربی یا فارسی الفاظ کی ماہیت سے بحث کرتے ہیں تو ہم لوگ بجز آتنا و صدقنا یا کفرنا و کذبنا کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔ قرآن پاک نے اپنی زبان کے بارے میں عربی میں ”ہونے کا دعوا کیا ہے، علمائے قرآنیات کی ایک جماعت اس کا مطلب یہ لیتی ہے کہ اس کتاب میں غیر عربی کوئی لفظ نہیں آیا، دیگر علمائے قرآن کے اندر مترب الفاظ کی تعیین کر کے اس کے خلاف رائے قائم کی ہے۔ بہر حال یہ بزرگ زائد سے زائد یہ بتا سکے ہیں کہ نلاں لفظ اصلاً فارسی ہے یا قبلی یا سریانی وغیرہ۔ اس کے حسب نسب سے تفصیلی بحث اس لئے نہ کر سکے کہ جن دوسری زبانوں کے الفاظ قرآن میں استعمال ہوئے ہیں ان سے وہ بقدر ضرورت واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ اس بحث پر سیر حاصل بحث اگر کسی نے کی تو وہ آرتھر جیفری ARTHUR JEFFERY ایک انگریز مستشرق ہے۔ اس کی کتاب ’THE FOREIGN VOCABULARY OF THE QURAN‘ پڑھ کر آپ کہیں کہیں اختلاف تو کر سکتے ہیں، مگر اس کی محنت اور ذررف نگاہی کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ مولف نے اس کے نکتے وقت وہ سب کتابیں اپنے سامنے رکھی ہیں جو مشرق و مغرب دونوں میں اس موضوع پر لکھی جا چکی تھیں۔ چونکہ احادیث کے مجموعے مختلف انداز سے مرتب کئے گئے ہیں، اس لئے ان میں سے کسی خاص حدیث کی تلاش اس وقت تک آسان نہیں، جب تک تلاش کرنے والے کو ان مجامع کے شتملات پر کافی عبور نہ ہو۔ اس دشواری کو دور کرنے کے لئے علمائے اسلام نے مختلف انداز کے انڈکس مرتب کر کے غیر محدثین یا کم حافظہ علماء کے لئے سہولتیں پیدا کیں۔ تحفۃ الاشراف، المباح الصغیر اور کنز العمال وغیرہ کتابیں اس کوشش کا کامیاب نمونہ ہیں۔ لیکن جیسے جیسے حافظہ کمزور ہوتا جا رہا ہے اور مہارت گھٹ رہی ہے، اس کی ضرورت بڑھتی جا رہی ہے کہ احادیث کے اندر متعل تمام الفاظ کا انڈکس مرتب کیا جائے، تاکہ ممکنہ آسانی کے ساتھ ہر حدیث تک رسائی ہو سکے۔ یہ کام بہت بڑا بھی تھا اور بے حد دشوار بھی، مگر مستشرقین کی ایک جماعت نے اس فولادی قلعے کو بانی کر کے بہا دیا۔ المعجم المفرد للفاظ الحدیث النبوی کے نام سے ایک جامع کتاب مرتب کر کے چھاپنا شروع کر دی جس کی ۴ جلدیں اب تک چھپ چکی ہیں۔ اس کتاب کی مدد سے آپ چند لمحوں میں صحاح ستہ، مؤطا امام مالک، مسند احمد بن حنبل اور سنن دارمی کی کسی حدیث کے بارے میں معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ کن کن کتابوں کے اندر کون کون سے

ابواب میں مذکور ہے۔ اس کے مرتبین کی تعداد جلد اول میں ۳۸ اور جلد چہارم میں ۴۵ بتائی گئی ہے، ان میں صرف ۳ مسلمان نام، ڈاکٹر ہدایت حسین مرحوم، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مدظلہ اور اے منصورہ نظر آتے ہیں، یہ غیر العقول کام ہالینڈ کے مستشرق شہیر و سنک A. G. WENSINCK کی قیادت میں ہوا ہے۔ تاریخ و سیرت و جغرافیہ پر بھی ان حضرات کا کام قابل رشک ہے۔ سیرت ابن ہشام، طبقات ابن سعد، تاریخ طبری، تاریخ مسعودی، تاریخ یعقوبی، تاریخ بلاذری اور مغازی واقعی جیسی کتابیں انھیں کی تصحیح سے چھپی ہیں۔ یہی صورت حال ادبیات کی ہے کہ متقدمین کی بیشتر نادر و نایاب کتابیں انھیں کی تلاش و تحقیق کے زیر سایہ دوبارہ زندہ ہوئی ہیں۔ ان کی تصحیح و تفسیر کے بعد کتنی نادر کتابیں شائع ہوئیں، یہ دیکھنا ہوتا جو نجیب العقیقی کی المستشرقون (عربی) یا ابوالقاسم کی فرہنگ خاور شناسان ملاحظہ فرمائیے۔

ڈاکٹر بروکلیمان G. BROCKELMANN نے تمام عالم کے عربی مخطوطات کی اور پروفیسر سٹوری C. A. STOREY نے دنیا کے فارسی مخطوطات کی حیرت انگیز فہرستیں مرتب کر دی ہیں۔ جن حضرات کو انھیں استعمال کرنے کا موقع ملتا رہتا ہے، وہ ان کتابوں کی جامعیت اور افادیت سے کما حقہ واقف ہیں۔ یہی صورت حال پروفیسر براؤن E. G. BROWNE کی تاریخ ادبیات فارسی کی ہے کہ خود ایرانی علماء بھی اس سے بہتر کتاب ابھی تک مرتب نہیں کر سکے۔ ادبیات عرب کی تاریخ پر مصر و شام کے متعدد عالمان نے کتابیں لکھی ہیں، لیکن ڈاکٹر نکلسن کی کتاب تا ایں دم اپنی جگہ پر ہے۔

غرض یہ ہے کہ اہل یورپ نے عربی و فارسی زبان کی جو کتابیں شائع کی ہیں، ندرت، تلامت، تصحیح، تہذیب اور صفا میں ان کا یہ عالم ہے کہ موجودہ عربوں کی ہمت اس سے قاصر ہو گئی کہ ان کا مثیل پیش کر سکیں، لہذا بعض عرب اداروں نے ان کے عکس چھاپ دینے کو اپنا کمال خدمت قرار دے لیا ہے۔

ان علماء کے اتنے بڑے بڑے اور اتنے زیادہ کام کر لینے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جن زبانوں پر یہ لوگ کام کرتے ہیں، پہلے اپنے مقام پر ان کا بھرپور علم حاصل کرتے ہیں۔ بعد ازاں متعلقہ ملک میں جا کر اپنی زبان دانی کی تکمیل کرتے ہیں اور جب خود کام کرنے بیٹھتے ہیں تو ان تک شک و شبہ اور انتہائی لگن اور خلوص سے اسے پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ نتیجتاً ان کا کام پائدار بھی ہوتا ہے اور مفید بھی۔ میں یہ عرض نہیں کر رہا ہوں کہ ان کے کاموں میں غلطیاں نہیں ہوتیں، خود میں نے بہت سی غلطیوں کی گرفت کی ہے اور دوسرے علماء و فضلاء کی بتائی ہوئی ان کی غلطیاں بھی میری نظر سے گزر چکی ہیں۔ ان میں صرف

اختلاف نقطہ نگاہ یا سہو سے پیدا ہونے والی کوتاہیاں ہی نہیں ہوتیں، ایسی لغزشیں بھی ہوتی ہیں جو غلط فہمی کا نتیجہ قرار پاتی ہیں۔ لیکن ان کا غلط ان کے صواب کے مقابلے میں ناقابل التفات ہے، اس لئے ہم مجبور ہیں کہ اپنے لب ان کی ستائش ہی میں کھولیں اور ان کے احسانات کا برابر بشکر یہ ادا کرتے رہیں کیونکہ یہ لوگ مشرقیات پر عموماً اور اسلامیات پر خصوصاً آشنا کام نہ کر چکے ہوتے، تو آج ہم بہت کچھ محروم الارث ہوتے۔

ان کے بالمقابل ہم اولاً تو کام ہی کم کرتے ہیں، اور کرتے بھی ہیں تو انتہائی سہل انگاری اور بے حد بے دلی کے ساتھ۔ گویا وہ کام ہم پر بار ہے۔ میری دانست میں اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم میں جو قدیم اندازِ فکر کے ہیں، وہ مغربی علوم اور زبانوں سے ناواقف ہیں، اور جن کی تعلیم جدید انداز پر ہوئی ہے، وہ نہ صرف عربی و فارسی علوم و فنون میں پس ماندہ ہوتے ہیں بلکہ خود زبانِ عربی و فارسی کا ضروری علم بھی نہیں رکھتے۔ چنانچہ بہت سے تاریخ ہندوستان کے مسلم عہد پر کام کرنے والے سرے سے فارسی نہیں جانتے، اس لئے یا کسی منشی سے معمولی معادضے پر فارسی تاریخوں کا ترجمہ سُن کر نتائج نکالتے ہیں یا انگریزی تراجم پر اپنے کام کا مدار رکھتے ہیں۔ ایک اسکالر ہندی شاعری پر اسلامی تصوف کے اثرات کے عنوان پر ڈاکٹریٹ کے لئے مقالہ لکھ رہے تھے اور فارسی ہی نہیں اُردو سے بھی ناواقف تھے۔

چونکہ ہندوستان ہمیشہ سے علمی دنیا میں سر بلند رہا ہے، پھر یہاں علمی ذخائر کی بھی فراوانی ہے، اب حکومت بھی تحقیقاتی مساعی میں فراخ دلی سے امداد کرنے کو آمادہ رہتی ہے، لہذا یہاں کے اربابِ علم و دانش کو کوتاہ دستی سے کام نہیں لینا چاہیے اور نہ صرف خود اعلیٰ علمی کام کرنا چاہیے بلکہ اپنی تعلیمی و تدریسی رہنمائی سے ایسی نسل بھی تیار کر دینا چاہیے، جو دنیائے علم میں عموماً اور اسلامیات میں خصوصاً ملک کے قوم کے شایانِ شان کام کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔ اگر اس طرف توجہ نہ کی گئی، تو وہ وقت قریب ہے جب کم از کم جدید دانش گاہوں میں عربی اور فارسی کے جاننے والے عنقا ہو جائیں گے۔ کیونکہ دنیائے علم کا مشرقی شعبہ بالخصوص انحطاط کے لحاظ سے بے حد تیز رفتار ہے۔

آخر میں ایک بات اور عرض کرنا ہے۔ قرآن کا مخالفانہ مطالعہ کرنے والوں نے اس کی تعلیم کو حقیر ثابت کرنے کے لئے اس کے مشتملات پر مذہبی، سائنسی اور تاریخی اعتراضات کئے ہیں۔ مثلاً کبھی یہ کہتے ہیں کہ ان کے عقائد و اعمال قدیم مذہبی لومشستوں سے ماخوذ ہیں۔ کبھی فرماتے ہیں کہ اس کے فلاں فلاں قصے یا فلاں فلاں قصوں کے مخصوص اجزائے سر دیا ہیں کیونکہ تاریخیوں میں ان کا ذکر نہیں ملتا یا اس کے بیان کے خلاف

مذا ہے کبھی ارشاد ہوتا ہے کہ آسمان و زمین وغیرہ کائناتی حقائق کا تذکرہ غیر عالمانہ ہے۔ موجودہ علم و تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ آسمان صرف حد نظر ہے، زمین سورج کے گرد اور چاند زمین کے گرد گھوم رہا ہے، نیر فلک ایک ہے یا پھر ۹ وغیرہ۔

ہندوستان و مصر کے علمائے اسلام نے مذکورہ بالا علماء کے مقابلے میں جو رویہ اختیار کیا، وہ نقل کو عقل کے مطابق ثابت کرنے کا تھا۔ آپ حضرات بخوبی واقف ہیں کہ مادی علم روز بروز ترقی کر رہا ہے اور جو آج کی حقیقت ہے، وہ کل کا باطل بن رہی ہے۔ میری حقیر رائے میں اب یہ کوشش ختم کر دینی چاہیے اور قرآن پاک کے مشتملات کو جو انٹوں مان لینا چاہیے کیونکہ اگر ہم اپنے پیشرو مفسروں اور تکتکوں کی پیروی میں عقل و نقل کے تطابق کی ایسی ہی کوشش کرتے رہے تو جن لوگوں کی تسکینِ طبع کے لئے یہ کام کیا جاتا ہے خود وہی یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ قرآن میں سرے سے حقائق کا ذکر ہی نہیں، ورنہ اس کی حقیقتیں آئی ناپائیدار نہ ہوتیں کہ مادی علم کے ہر دباؤ کے ساتھ مٹ جاتیں۔

علاوہ انہیں اُنھیں یہ خیال بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ قرآن پاک جن پر پہلی بار نازل ہوا تھا، وہی اس کو نہ سمجھ سکے، اور نہ صرف یہ کہ وہی نہ سمجھے بلکہ یہ سلسلہ تا ایں دم جاری و ساری ہے اور خدا جانے کب تک یہی صورت رہے گی۔ میرا دل ان دونوں باتوں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

بے شک قرآن میں ایسے حقائق بھی مذکور ہیں جن کی ماہیت فہم انسان سے بالاتر ہے اور رہے گی۔ مگر جن آیات میں یہ حقائق مذکور ہیں، قرآن نے انھیں متشابہات فرمایا، اور ان پر بحث و تمحیص اور ان کی تاویل و تفسیر سے روکا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں ان آیات پر غور و غوض کرنے والے دل کے مریض ہوتے ہیں۔ اہل ایمان کا کام یہ ہے کہ وہ انھیں برحق مانتے ہوئے ان پر بحث و تمحیص سے احتراز کریں۔ کیونکہ وہ کسی طرح بھی ان آیات کے حقیقی مطلب کو نہ پاسکیں گے اور نتیجتاً تفسیر بالرائے کے جرم کے مرتکبوں گے۔

مولانا ابوالکلام مرحوم و مغفور نے ترجمان القرآن کے دیباچے میں تفسیر بالرائے کے بارے میں لکھا ہے۔
 ”تفسیر بالرائے میں رائے یعنی لغوی نہیں ہے بلکہ رائے مصطلحاً شارع ہے، اور اس سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اس لئے نہ کی جائے کہ قرآن کیا کہتا ہے بلکہ اس لئے کی جائے کہ ہماری کوئی ٹھہرائی ہوئی رائے کیا چاہتی ہے اور کس طرح قرآن کو کھینچ تان کر اُس کے مطابق کر دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً قرآن کے طریق استلال کو منطقی جامہ پہنانا، یا جہاں کہیں آسمان اور کوکبِ نجم

کے الفاظ آگئے ہیں، یونانی علم ہیئت کے مسائل چپکانے لگنا یقیناً تفسیر بالرائے ہے ” یا مثلاً آج کل ہندوستان اور مصر کے بعض دانش فروشوں نے یہ طریق اختیار کیا ہے کہ (انہیں کے لفظوں میں) نمازہ حال کے اصول علم و ترقی قرآن سے ثابت کئے جائیں، یا بقول اُن کے فلسفہ و سائنس اس کی ہر آیت میں بھردیا جائے۔ گو یا قرآن صرف اس لئے نازل ہوا ہے کہ جو بات کو پرنسپل اور نیوٹن نے یا ڈارون اور ویلس نے بغیر کسی الہامی کتاب کی، فلسفہ اندیشیوں کے دریافت کر لی، اُسے چند صدی پہلے مسطور اور بھارتوں کی طرح دنیا کے کان میں پھونک دے اور پھر وہ صدیوں تک دنیا کی سمجھ میں نہ آئیں یہاں تک کہ موجودہ زمانے کے مفسر پیدا ہوں اور تیرہ سو برس پیشتر کے معنی حل فرمائیں یقیناً یہ طریق تفسیر بھی ٹھیک تفسیر بالرائے ہے۔“ (ترجمان القرآن ۱/۷۲)

سر سید علیہ الرحمۃ کی تفسیر بالرائے پر یہی اعتراض کیا گیا کہ یہ روز روز کی تادیلیں تو قرآن کو کھلونا بنادیں گی تو انہوں نے مقدمہ تفسیر القرآن (صفحہ ۱۹) میں ارشاد فرمایا :-

” ہم اس طعن کو بطور ایک بشارت کے نہایت خوشی سے تسلیم کرتے ہیں، کیونکہ ہمارا یقین ہے کہ قرآن مجید حقیقت امور کے مطابق ہے، کیونکہ وہ ورد آف گاڈ ہے اور بالکل ورک آف گاڈ اس کے مطابق ہے۔ مگر اس میں بڑا معجزا یہ ہے کہ ہمارے ہر درجہ علم میں ان امور میں جن کی ہدایت کے لئے قرآن نازل ہوا ہے، یکساں ہدایت ہے۔ اس کے الفاظ ایسے اعجاز سے نازل ہوئے ہیں کہ جہاں تک ہمارے علوم کی ترقی ہوتی جائے گی، اور اس ترقی یافتہ علوم کے لحاظ سے ہم اس پر غور کریں گے، تو معلوم ہو گا کہ اس کے الفاظ اس لحاظ سے بھی مطابق حقیقت ہیں، اور ہم کو ثابت ہو جائے گا کہ جو معنی ہم نے پہلے قرار دیئے تھے اور اب غلط ثابت ہوئے، وہ ہمارے علم کا قصور تھا، نہ الفاظ قرآن کا۔ پس اگر ہمارے علوم کو آئندہ زمانے میں ایسی ترقی ہو جائے کہ اس وقت کے امور محقق کی غلطی ثابت ہو، تو ہم پھر قرآن مجید پر رجوع کریں گے اور اس کو ضرور مطابق حقیقت پائیں گے اور ہم کو معلوم ہو گا کہ جو معنی ہم نے پہلے قرار دیئے تھے وہ ہمارے علم کا نقصان تھا، قرآن مجید ہر ایک نقصان سے بری تھا۔“

مجھے یقین ہے کہ میری طرح بہت سے اہل علم بھی اس جواب سے مطمئن نہیں ہوں گے، اور وہ اس کا حل تلاش کر چکے ہوں گے یا تلاش کرنے میں مشغول و مصروف ہوں گے، بہر حال میں نے اپنی جگہ جو سوچا سمجھا اوٹے کیا

ہے وہ پیش کرتا ہوں :-

یہ ہم سب جانتے ہیں کہ قرآن عربی زبان میں قریش کے محاورے پر نازل ہوا ہے۔ یہ بھی سب کا مسلمہ ہے کہ الفاظ قرآنیہ کبھی حقیقی معنی میں استعمال ہوئے ہیں اور کبھی مجازی میں۔ یہی وجہ ہے کہ خود قرآن پاک میں ذات باری کے لئے ایسے کثرتاً شئی "کی تصریح کے ساتھ ید اللہ فوق ایدہم، اینما تووا فتم وجہ اللہ، ثم استوی علی العرش اور وصح کرسیہ السموات والارض بھی موجود ہے۔ اگر ید وغیرہ کا استعمال مجازی معنی میں استعمال کیا جائے، تو ذات باری کی تجسیم کا قائل ہونا پڑے گا جو جمہور اسلام کے خلاف ہے۔ علاوہ انہیں قرآن پاک میں انہیں پنجیوں اور کتابوں کا ذکر ہے، جن سے اہل عرب آگاہ تھے، انہیں عقائد و رسوم کی تردید یا تائید ہے، جو عربوں یا ان کے گرد و پیش کی اُمتوں میں پائے جاتے تھے، اور انہی اُمتوں کے قصے مذکور ہوئے ہیں جو عربوں کی جانی پہچانی تھیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مخالفین اولین پر وہ اخلاقی اثر نہ ہوتا جو براہ راست علم و معرفت کا نتیجہ بڑا کرتا ہے نیز قرآن میں ایشیا، افریقہ اور یورپ کے دور دست ملکوں اور پنجیوں اور اُمتوں کے قصے بیان کئے جاتے تو عرب کے عام لوگ بھی اُسے من گھڑت اور خیالی قصے مان کر نظر انداز کر دیتے۔

یہی صورت حال انسان سے متعلق علم کی بھی ہے کہ قرآن میں وہی باتیں مذکور ہوئی ہیں جن سے اہل عرب آگاہ تھے۔ کوئی ایسی بات جو اس وقت کے علم کے خلاف ہو بیان نہیں کی گئی، کیونکہ ایسا کیا جاتا تو بحث و تمحیص کا رخ اخلاق سے ہٹ کر علم تشریح الاعضاء اور تشریح افعال الاعضاء کی طرف ہو جاتا، جو قرآن پاک کا منشاء نہ تھا مثلاً قرآن پاک کی آیات ختم اللہ علی قلوبہم۔ یا۔ لہم قلوب لا یعقلون بہا،۔ یا۔ الامن الی اللہ بقلب سلیم سے معلوم ہوتا ہے کہ علم و ادراک اور تمیز و اختیار اور رد و قبول کا سرچشمہ دل ہے۔ حالانکہ ہم سب اُقف ہیں کہ مذکورہ بالا خدمات دل سے نہیں، دماغ سے متعلق ہیں اور دل کا کام پوسے جسم میں خون پہنچاتے رہنا ہے اور بس۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ اس وقت کی دنیا ہر طرح کی حس و حرکت کا منبع دل کو مانتی تھی۔ عرب بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے۔ ایسی صورت میں قرآن میں دل کی جگہ دماغ ہوتا تو اہل عرب سے سول اللہ صلعم کو روزِ زہرہ کے عام علم سے بھی نا آگاہ سمجھتے اور قبولِ اسلام کی راہ میں بہت سی اور دشواریاں پیدا ہو جاتیں۔

میری دانست میں قرآن کے اندر ہر برج آسانی کا ذکر بھی اسی نوع کا ہے۔ اور یہی توجیہ سات آسمانوں اور سات زمینوں وغیرہ کی بھی ہے۔ اہل عرب اسی کے قائل تھے، لہذا قرآن میں ان کے ان جیسے مسلمات کی علمی تردید نہیں کی گئی، کیونکہ نزولِ قرآن کا یہ منشاء ہی نہ تھا، بلکہ ان مسلمات کی پشت پر جو عقائدِ باطلہ کام کر رہے تھے، ان پر

بھر پور حملہ کیا گیا، اور مختلف آیات میں یہ بتایا جاتا رہا کہ زمینوں، آسمانوں، سورج، چاند، زحل و شتری وغیرہ تمام اجرام سماوی کا خالق، مالک اور مدبر صرف اللہ ہے۔ خود ان میں کسی طرح کی ارادی قوت و طاقت نہیں کہ جس سے کام لے کر انسان کو نفع یا نقصان پہنچا سکیں، اسی لئے یہ معبود بننے کی صلاحیت سے بھی یکسر محروم ہیں۔

اسی پر دوسرے طبیعیاتی امور کو قیاس فرمایا جیچے کہ ان کا مذکور بھی مخالفین و تین کے علمی مسلمات کے مطابق کیا گیا ہے۔ رہے قصصِ قرآنی، تو وہ بھی وہی مذکور ہیں اور اسی انداز پر مذکور ہیں، جن سے اہل عرب، یہودی، عیسوی، صابئی اور مشرک واقف تھے۔ ہاں، جہاں کہیں ان لوگوں نے کوئی ایسی بات کسی ہستی سے منسوب کر رکھی تھی، جو تعلیماتِ اسلام کے خلاف تھی، اس کی تردید ضرور کر دی گئی ہے، تاکہ بیانِ قصص سے جو فائدہ مطلوب ہے، وہ کسی طرح متاثر نہ ہو، جیسے حضرت عیسیٰ و مریم علیہما السلام کے واقعات کے بیان میں نظر آتا ہے۔

میں اپنے مدعا کو مختصر مگر جامع الفاظ میں اس طرح ادا کر سکتا ہوں کہ قرآن پاک میں جو کچھ مذکور ہے وہ تمام تر حقیقت ہے۔ مگر حقائقِ قرآنی کی دو قسمیں ہیں۔ حقائقِ نفس الامری اور حقائقِ مسلمہ قوم۔ ذات و صفاتِ باری، ملائکہ، جنت و دوزخ وغیرہ سے متعلق قرآن کا حصہ معنایاً تو حقیقتِ نفس الامری ہے، مگر لفظاً حقیقتِ مسلمہ قوم ہے۔ زمین، آسمان، سورج، سورج اور چاند وغیرہ کا ثانی اشیا کا تذکرہ یا قصصِ امثالِ قرآنی کا بیان انہیں دونوں قسموں کے اندر سما جاتا ہے۔

قرآن کے حقائقِ نفس الامریہ غیر متبدل ہیں۔ یہ ان ازل تا اب دایک رہیں گے۔ رہے حقائقِ مسلمہ قوم تو ان میں علم کی ترقی کے ساتھ تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ہوگا۔ لہذا ہمیں عقل و نقل کے تطابق کی مزید کوشش ترک کر دینا چاہیے اور قرآن کو فلسفہ و حکمت کی جگہ تزکیہٴ نفس، تدبیر منزل اور سیاستِ مدن کے میدانوں میں صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرنے والی کتاب مان کر اُس پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔

